ادب کسے کہتے ہیں

# ادب کسے کہتے ہیں

مصنف

اطہر پرویز

ترقیِ اردو بورڈ
نئی دہلی

# پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائینسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچّوں کے ادب، لغات اور سائینسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقیِ اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائینسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بہت سی نصابی کتابیں، بچّوں کے ادب، علمی، ادبی اور سائینسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند

# دیباچہ

ادب کسے کہتے ہیں؟ اس موضوع پر اردو میں بچوں کے لیے کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس لیے اس کتاب میں میں نے خاص طور پر یہ کوشش کی ہے کہ بچوں کو ادب کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائی جائیں۔ میں نے یہ کتاب بہت سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں لکھی ہے تاکہ اس کے سمجھنے میں بچوں کو دقت نہ ہو۔ اس لیے اصولوں اور قاعدوں پر بحث کرنے کے بجائے مثالوں کے ذریعہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ بچے آسانی سے سمجھ سکیں اور انھیں یہ معلوم ہو کہ عام زندگی کے مسائل اور طور طریقوں سے ادب کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا شعر و ادب کے بارے میں یہ خیال بھی دور ہوگا کہ ادیب یا شاعر پیدائشی ہوتے ہیں۔ بلکہ بچوں میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوگی اور انھیں ادب سے اپنی قربت کا احساس ہوگا۔ ان کی اجنبیت ختم ہو جائے گی، اور بچے بھی صحیح طور پر سمجھ سکیں گے کہ ادب کسے کہتے ہیں اور اس کا زندگی سے کیا رشتہ ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو محض کہانیاں ہی نہ سنائیں بلکہ انھیں ادبی طریق کار سے روشناس بھی کریں۔ اس طرح انھیں اپنے ادب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ اس سے زیادہ لطف لے سکیں گے۔

اطہر پرویز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

بچّو! تم کتابیں پڑھتے ہو۔ کچھ کتابیں قصّے کہانیوں اور گیتوں کی ہوتی ہیں، اور کچھ دوسری کتابیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں بہت سی معلومات ہوتی ہیں۔ یوں تو کتاب، قصّے کہانی کی ہو یا معلومات کی، کتاب بہر حال کتاب ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی کتابوں میں فرق ہوتا ہے۔ معلومات کی کتابوں سے ہمارا علم بڑھتا ہے جو باتیں ہم نہیں جانتے، ان کتابوں سے سیکھ لیتے ہیں۔ یہ کتابیں سائنس کی ہوتی ہیں، جغرافیہ اور تاریخ کی ہوتی ہیں۔ ہم ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی بدولت ہمیں دنیا کے بارے میں کتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہماری معلومات کتنی بڑھ جاتی ہے لیکن پھر بھی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان میں ہمارا جی نہیں لگتا اور ہم چاہتے ہیں کہ قصّہ کہانی کی کتابیں پڑھیں ـــــ کوئی مزیدار نظم پڑھیں۔ جب ہم ایسی کتابیں پڑھتے ہیں تو ہمیں بڑا مزا آتا ہے۔ کیوں آتا ہے نا مزا!

ہاں تو ایسی کتابوں کو جن کو پڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ ہمیں نیکی اور بدی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہمیں خوبصورتی اور بدصورتی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اِن کتابوں کو پڑھ کر ہم کو ایسا لگتا ہے کہ ہم ایسی دنیا میں پہنچ گئے ہیں جو ہماری دنیا

سے تھوڑا الگ ہے لیکن پھر بھی ہماری اپنی دنیا ہے اس میں ہماری دُنیا کی سچائی بھی ہوتی ہے اور پھر ان کے ساتھ کتنے اَن دیکھے سپنے ہوتے ہیں۔ آپ نے ایسی کہانیاں ضرور پڑھی ہوں گی، جن میں کوہ قاف کا ذکر ہوگا، جنوں پریوں کا حال ہوگا۔ ان میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ قالین اڑ رہے ہیں، پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ رہے ہیں۔ آنکھوں میں ایسا سرمہ لگایا کہ زمین کے سارے چھپے ہوئے خزانے دکھائی دینے لگے۔ پاؤں میں ایسے مسالے لگائے گئے، جن سے آدمی دریاؤں پر ٹہلتا ہوا دوسرے پار پہنچ سکے۔ جس زمانہ میں ایسی کہانیاں لکھی جاتی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو آج کے ہوائی جہاز تھے اور نہ لوگوں کو زمین کے اندر کی کانوں کا کوئی علم تھا۔ اور نہ ابھی انسانوں نے دریاؤں پر پُل بنائے تھے۔ لیکن وہ اپنے خیالات کی دنیا میں ہوا میں اُڑنے کے خواب دیکھا کرتا، زمین کے چھپے ہوئے سونے چاندی کے خزانوں کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ دریاؤں کو پار کرنے کے تصور میں مگن رہتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس کی ایک عملی زندگی بھی تھی۔ اگر خیال کی دنیا میں وہ جڑی بوٹی اور مسالے کو پیروں سے رگڑ کر دریاؤں پر چلتا چلا جاتا تھا اور اُسے آسانی سے پار کر لیتا تھا تو دوسری طرف وہ عمل کی دنیا میں کشتی بنا رہا تھا، دریاؤں پر پُل بنا رہا تھا۔ گاڑیاں چلانے کے لیے پہیئے کی ایجاد کر رہا تھا۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ اگر انسان ایسے اَن دیکھے سپنے نہ دیکھتا تو وہ نہ کوئی ہوائی جہاز اڑا سکتا، نہ دریاؤں پر پُل بنا سکتا۔ اگر وہ ایسے قصّے کہانیاں نہ سنتا، تو اُس کے دماغ کو اتنی اچھی طرح سوچنے کی عادت بھی نہ پڑتی۔ آخر وہ سوچتے سوچتے خواب دیکھتے دیکھتے ایک ایسی دنیا بنانے میں کامیاب ہو گیا کہ جو اُس دنیا سے ملتی جلتی ہو۔

خوابوں کے بارے میں نفسیات کے سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ ہماری ان خواہشوں کا اظہار ہیں، جن کو ہم عملی زندگی میں نہیں حاصل کر سکتے۔ آپ نے اکثر خواب میں دیکھا ہوگا کہ آپ اسکول ماسٹر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یا آپ ملک کے وزیر اعظم ہو گئے ہیں۔

'ادب' میں ہم کو ایسے انسانی خواب نظر آتے ہیں۔

آیئے ادب کو اور زیادہ سمجھنے کے لیے ہم پہلے یہ جانیں کہ زبان کسے کہتے ہیں۔ زبان جو ہم بولتے ہیں۔ وہ زبان جس کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ سوچیے کہ اگر آپ گونگے ہوتے تو کیا ہوتا۔ یہی ہوتا نا کہ آپ کی بات آپ کے دل ہی دل میں رہتی اور آپ کسی سے اپنے دل کی بات کبھی نہ کہہ سکتے۔ لیکن خدا نے انسان کو ایک ایسی طاقت بھی دی ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکے۔ چنانچہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انسان نے اسی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اپنے خیال کے لیے لفظوں کا لباس ایجاد کیا۔ اس نے ہر چیز اور ہر خیال کے لیے ایک خاص قسم کی آواز کو آپس میں طے کر لیا کہ کس بات کے لیے کیسی آواز نکالی جائے۔ یہی آواز تجربے اور مفہوم کے تعین کے بعد لفظ میں بدل گئی۔ اب اس مخصوص آواز کو ہم 'لفظ' کہنے لگے۔

لیکن بھائی، دنیا تو بہت بڑی تھی بہت بڑی۔ اور آدمی کے پاس ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا آسان نہیں تھا اس لیے جو جہاں رہتا وہ اپنے لیے الگ الگ آوازیں طے کر لیتا۔ اب تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہ گیا۔ اب تو وہ اپنے دل کی ہر بات دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ جو بات سوچتا ہے، اسے

کہہ دیتا ہے اور دوسرا اُس کی بات سمجھ لیتا ہے۔ وہ لوگ جو ابھی تک اشاروں سے کام چلا رہے تھے، عجیب و غریب آوازیں نکالا کرتے تھے اور پھر بھی اصل بات دوسروں کو نہ سمجھا پاتے تھے۔ سوچیے یہ لوگ کتنا جھنجھلاتے ہوں گے، ان کو کتنا غصّہ آتا ہوگا۔ اب اِن لوگوں کی پریشانی دور ہو گئی۔ انھوں نے ہونٹ ہلائے اور اپنی بات دوسرے کو سمجھا دی۔ لیجیے زبان ایجاد ہو گئی۔ اور اس طرح وہ روزمرّہ کا کام چلانے لگے۔

لیکن آپ کو اگر دونوں وقت کھانا دیا جائے اور کہا جائے کہ بس کھاؤ پیو اور چپ چاپ پڑے رہو تو آپ خود سوچیے کہ یہ جینا بھی کوئی ہوگا۔ جب شام کا وقت آئے گا، دھوپ اُترے گی تو آپ کا جی چاہے گا کہ باہر نکلیں اور زندگی کا لطف اُٹھائیں۔ جب آپ کسی اچھے منظر کو دیکھیں گے تو آپ کے دل پر عجیب کیفیت چھا جائے گی۔ جب بادل گھِر کر آئیں گے تو آپ کا دل مچلے گا۔ یہ کیفیت عام کیفیت سے الگ ہوگی اور آپ اس کا ذکر ایسی زبان میں کریں گے جو زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوگی۔ آپ شام کے وقت دریا کی سیر کو جائیں، چاند نکلا ہوا ہو تو چاند کا عکس ندی میں دیکھ کر آپ کیا کچھ محسوس نہیں کریں گے۔ اس بات کو اگر زبان سے ادا کیا جائے تو اس کے دو طریقے ہوں گے۔

پہلا طریقہ تو یہ ہوگا کہ آپ کہیں گے کہ:-

- "چاند کا عکس ندی میں پڑ رہا ہے۔"

دوسرا طریقہ یہ ہوگا ـــــ

- "تم ندی میں جا کر دیکھو جب ندی میں نہائے چاند"

اس وقت آپ دیکھیں گے کہ پہلا طریقہ اس کیفیت کو ادا کرنے میں کامیاب

نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں ایک سچائی کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔
دوسرا طریقہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں اس کیفیت کا اظہار ہے جو آپ کے دل پر گزر رہی ہے۔

میں اس کو اب ایک اور مثال کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک آدمی شام کے وقت باغ میں خوش خوش سیر کرنے کے لیے جارہا ہے اس کو اس طرح خوش دیکھ کر آپ کو بھی خوشی محسوس ہوئی اور آپ اس منظر کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس منظر کو بیان کرنے کے لیے آپ کہتے ہیں۔

- "باغ میں ہنستا ہوا جارہا ہے"

لیکن ایک اور طریقے سے آپ اسی کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں۔

- "جارہا ہے باغ میں کھِلتا ہوا"

جہاں تک کہ حقیقت اور سچائی کا تعلق ہے، پہلے طریقے سے اس کا اظہار ہو گیا ہے، لیکن دوسرے طریقے سے یہ اظہار زیادہ بھرپور طور پر ہوا ہے حالانکہ یہاں صرف لفظوں کی ترتیب بدل دی گئی ہے اور ایک لفظ بدلا گیا ہے۔

آیئے اس لفظ کو ذرا غور سے دیکھیں۔ پہلے طریقے سے آپ نے "ہنستا" کہا اور دوسرے طریقے سے "کھِلتا" کہا یوں تو عام طور پر دیکھا جائے تو ہنستا ہوا اصل بات کو صحیح طریقے سے ظاہر کر دیتا ہے گویا واقعہ کا اظہار ہو گیا۔ لیکن آپ نے "کھِلتا ہوا" کہہ کر اس کیفیت کا حق ادا کر دیا جو باغ میں جاتے ہوئے اس آدمی کے دل میں تھی۔ کیونکہ وہ آدمی باغ میں جارہا ہے ـــ باغ میں جہاں پھول کھلتے ہیں۔ پھول کا کھِلنا گویا پھولوں کا ہنسنا ہے۔ اس لیے باغ میں پھولوں کی

رعایت سے کھلتا ہوا زیادہ موزوں ہے۔ جہاں تک زبان کی قواعد کا تعلق ہے پہلا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں قاعدے کے مطابق فعل بعد میں آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دوسرے میں فعل پہلے آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرا زیادہ موزوں ہے کیونکہ آپ کے ذہن میں جانے کا عمل پہلے آیا ہے۔ اس کے بعد باغ کا اور پھر اس کیفیت کا جو باغ کی کیفیت سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ دو طریقے ہیں جن سے ہم اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ پہلا طریقہ دونوں جگہ سیدھا سادا ہے لیکن دوسرے طریقے کو ہم ادبی کہہ سکتے ہیں۔ اس ادبی طریقے کی تعریف کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ وہ ہے جس میں روزمرہ کے خیالات سے زیادہ بہتر خیالات اور روزمرہ کی زبان سے بہتر زبان کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ طریقہ آج کا طریقہ ہی نہیں ہے بلکہ پرانے زمانے میں بھی جب لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، وہ ایک دوسرے سے جب اپنی بہادری کے کارنامے بیان کرتے ہوں گے، کہانیاں کہتے ہوں گے، پریوں کی داستانیں بیان کرتے ہوں گے، اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوں گے، تو اس کے لیے جو زبان استعمال کرتے ہوں گے، وہ روزمرہ کی زبان سے یقیناً مختلف ہوگی۔ یہ زبان زیادہ جذباتی ہوگی۔ لیکن زبان سے کہہ دینے کے بعد، بولے ہوئے الفاظ بہت دیر تک زندہ نہیں رہتے۔ پھر جو خیال ہوتا ہے، اس میں زیادہ گہرائی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جب کوئی چیز لکھی جاتی ہے تو لکھنے والے کا دماغ پورے طور پر اس بات کی طرف لگ جاتا ہے اور پھر جو بات لکھی جاتی ہے وہ بالکل واضح، صاف اور سوچی سمجھی ہوتی ہے۔ گویا لکھنے والا الفاظ

کے ذریعہ اسی طرح اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے، جیسے مصوّر کاغذ یا کنویس پر رنگوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ ادیب یا لکھنے والا کسی مادّی چیز کا سہارا نہیں لیتا جیسے گانے والا باجے کا سہارا لیتا ہے یا مجسمہ بنانے والا، مٹی یا پتھر کا۔ یا عمارت بنانے والا اینٹ، چونے، گارے اور دوسرے اوزار کا۔ ادب لکھنے والے کا اوزار تو اس کے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ وہ نہ صرف اپنے خیالات کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اپنے جذبات اور احساسات کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس لیے ادب لکھنے والے ادیب یا شاعر کو اپنے الفاظ کے استعمال سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ جیسے کہ کاریگر اپنے اوزار سے واقف ہوتا ہے۔ اس زبان کے الفاظ سے اس کا زندہ رشتہ ہونا چاہیے کوئی شخص کبھی ایسی زبان کا ادیب نہیں ہو سکتا جو اس زبان کے اونچ نیچ سے واقف نہ ہو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ زبان اس کے دل و دماغ میں اسی طرح بسی ہو کہ وہ اس میں سوتے سوتے اُٹھ کر پانی مانگ سکے یا پھر بے تکلف کسی سے بات کر سکے۔ اس زبان میں خواب دیکھ سکے۔

ہر زبان کے پاس الفاظ کا ایک خزانہ ہوتا ہے اس زبان کی مدد سے ایک آدمی مدرسے لے کر دفتر اور گھر سے بازار تک سینکڑوں کام کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ ہر بات چیت یاد رکھنے کی نہیں ہوتی۔ اخبار میں جو کچھ چھپتا ہے اسے آپ آج پڑھتے ہیں اور پھر اگلے دن ضائع کر دیتے ہیں کیونکہ اس کی قدر و قیمت ذرا سی دیر کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہر چھپی ہوئی چیز ادب نہیں ہوتی۔ ادب میں تو ایسی چیزیں ہوتی ہیں، جنھیں انسان سینے سے لگائے رہتا ہے۔ پرانے زمانے میں اچھی اور کارآمد باتیں چٹانوں یا پتروں پر لکھی جاتی تھیں، لیکن کاغذ کی

ایجاد نے لوگوں کو اس تکلیف سے بچا لیا اور پھر تو ادب کو زبردست بڑھاوا ملا۔

برطانیہ کی سب سے بڑی لائبریری برٹش میوزیم کے دارالمطالعے کی دیوار پر ایک کتبہ لکھا ہے:-

○ "آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس کا خیال رکھیے گا۔ یہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اگر دنیا سے کاغذ کا خاتمہ ہو جائے تو تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر جائے۔ کاغذ علم اور جہالت، راج اور نراج، غلامی اور آزادی کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہمارے دلوں کی اُمنگ ختم ہو جائے، جس کی بدولت انسان بڑے بڑے کام کرتا ہے ہمیں سوچنا چاہیے کہ کاغذ سے کیا مُراد ہوتی ہے؟"

میں تو یہی کہوں گا کہ کاغذ سے مراد وہ ادب ہوتا ہے، جہاں مُردے زندوں سے باتیں کرتے ہیں، ان کو رُلاتے ہیں، ہنساتے ہیں ایک تہذیب دوسری تہذیب سے ہاتھ ملاتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے گلے ملتی ہے۔ ایک زمانہ اپنی میراث کو پہچانتا ہے اور اس کی دولت سے اپنا دامن بھرتا ہے۔ دراصل ادب کے ذریعہ بہت سے انسانی رشتے قائم رہے ہیں۔ ادب کا چونکہ زبان سے تعلق ہے، اس لیے جیسے جیسے زبان ترقی کرتی جاتی ہے، ادب بھی ترقی کرتا جاتا ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین خیالات کو بہترین لفظوں میں، بہترین ترتیب کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔ اس میں سچ پوچھیے تو اپنے

ادب کسے کہتے ہیں

زمانے کے نہ صرف بہترین خیالات، الفاظ، اور ترتیب ہوتی ہے بلکہ اس میں اپنے زمانے کی سچی روح ہوتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔ تمام تاریخ کی کتابیں ختم ہو جائیں، صرف ادبی کتابیں باقی رہ جائیں تو ہم صرف انہیں ادبی کتابوں کی مدد سے انسانی تہذیب کی تاریخ تیار کر سکتے ہیں۔

لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ ہم ادب کیوں لکھتے ہیں، یہ زمانہ تو سائنس کا زمانہ ہے لیکن سائنس ہر وقت ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ ہم ہر وقت سائنس کی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔ ہم سائنس کے ذریعہ ہر بات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ اب آپ دیکھیے کہ اگر ہم کو اپنے

- ذاتی تجربوں کو بیان کرنا ہے

یا

- ملک، قوم اور ہم وطنوں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

یا

- عام انسانوں کی زندگی کے بارے میں بیان کرنا ہے

تو پھر ہم ادب کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ آپ تاج محل دیکھ کر آتے ہیں یا سمندر کے کنارے سیر کر کے آتے ہیں تو آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ نے اس وقت جو کچھ محسوس کیا، وہ اپنے دوستوں سے بیان کریں۔ اس کو آپ سیدھے سادے طریقے سے بیان نہیں کرتے بلکہ اسے چنے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ آپ نے جو کیفیت محسوس کی ہے وہ دوسروں تک پہنچ جائے۔

اس کے علاوہ ہم آپ ایک سماج میں رہتے ہیں۔ ہمارا تعلق ایک ملک اور قوم سے ہے ہمارے اوپر اس کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ان ہی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے ادیب اور شاعر حب الوطنی، قومی ترقی، امن و جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں اور اس کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا ہماری دلی کیفیت کو محسوس کر سکے۔ ہم اس کیفیت کو ذرا بڑھا چڑھا کر بھی کہتے ہیں تاکہ دلی جذبات کا اندازہ ہو سکے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہاں جب ہم اپنے مُلک کو ساری دنیا سے اچھا کہہ رہے ہیں تو ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم دنیا کے اور ملکوں کو بُرا کہنا چاہتے ہیں اور ان پر اپنی بڑائی ثابت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کو ہمارا وطن بہت اچھا لگتا ہے۔ اور یہ بات فطری بھی ہے۔ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمدؐ نے کہا تھا کہ 'وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے'، ہم اس خیال سے محسوس کرتے ہیں کہ گویا ہمارا وطن ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

یہ تو رہی وطن کی بات —— ہم وطن —— نہیں، وطن کے رہنے والوں سے بھی محبت کرتے ہیں اور صرف وطن کے رہنے والوں —— نہیں بلکہ ساری دنیا کے لوگوں سے۔ آپ جب کسی آدمی کو تکلیف میں دیکھتے ہیں تو آپ کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے آپ کو خود تکلیف ہو رہی ہے۔ یہی آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ دوسرے کی تکلیف کو محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس طرح اپنے ادب میں ان تمام چیزوں کو پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا بچہ جب دعا مانگتا ہے تو کہتا ہے

ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبّت کرنا

گویا اس طرح ہم نہ صرف اپنے خیالات اور جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں بلکہ ہم اچھائی اور نیکی کا پیغام بھی دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

ادب میں نیکی، اچھائی اور انسانی خوبیوں کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن نیکی کا یہ بیان سیدھے سادے طریقے سے نہیں ہوتا، کیونکہ نصیحتیں سننا کوئی پسند نہیں کرتا۔ آپ خود دیکھتے ہوں گے کہ جب آپ ہی سے کوئی نصیحت کی بات کی جاتی ہے تو بات صحیح تو معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے سننے میں آپ کو مزا نہیں آتا۔ اس لیے عقلمند لوگ اس نصیحت کی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ (اس کے) سننے میں مزا بھی آتا ہے اور آپ اسے اچھی طرح سمجھ بھی لیتے ہیں۔ ملیریا بیماری کی مشہور دوا 'کونین' کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ دوا بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اسے اگر (آپ) منھ میں رکھیں تو آپ کا منھ کڑوا ہو جائے اس لیے ڈاکٹروں نے یہ ترکیب کی ہے، کہ اس کو شکر میں لپیٹ کر گولیاں بنائی جاتی ہیں تاکہ کڑواہٹ محسوس نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ پیٹ میں جاکر دوا اپنا کام بھی کرے۔

(مثلاً) اگر آپ سے اصول اور قاعدے کے مطابق یہ کہا جائے کہ کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچانا چاہیے تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ جو آدمی دوسروں کے لیے گڈھا کھودتا ہے وہ خود بھی اسی گڈھے میں گرتا ہے تو اس کا زیادہ اثر ہوگا۔ کیونکہ پہلے بیان سے آپ کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بنی، لیکن دوسرے بیان سے

آپ کے سامنے ایک ایسے آدمی کی تصویر گھوم گئی جو دوسروں کو گرانے کے لیے گڈھا کھود رہا ہے اور آپ کے سامنے گڈھے میں گرنے کا منظر آگیا۔ یہ کہنے کا طریقہ زیادہ اثر کرتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک طریقہ اور ہے کہ ہم ایک کہانی بیان کرتے ہیں (آپ بھی) سنیئے:-

" کہتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایک گھوڑے اور ہرن میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک جنگل میں ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، غرض سب ایک ساتھ تھا۔ لیکن زیادہ میٹھے میں کبھی کبھی کیڑے بھی پڑ جاتے ہیں۔ ایک دن کسی معمولی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مار پیٹ کی نوبت آئی۔ گھوڑے کا جسم تو بھاری تھا ہی، ہرن ٹھہرا ہلکا پھلکا۔ اسی لیے ہرن نے اُچھل اُچھل کر گھوڑے کی خوب مرمت کی۔ گھوڑا اس وقت تو مار کھا کر چپ رہ گیا۔ لیکن وہ اس ذلّت کو نہ بھولا اور دل ہی دل میں ہرن کو مارنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اور جنگل میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرنے لگا۔

ایک دن گھوڑے کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو تیر کمان لیے شکار کی کھوج میں پھر رہا تھا۔ گھوڑے نے اس کے پاس جا کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ " بھائی آدمی! اگر میرا ایک کام کر دو تو میں تمام عمر تمہارا احسان مانوں گا" آدمی نے کہا۔ " بتاؤ تو سہی کیا کام ہے۔ اگر میرے

کرتے کا ہوا تو ضرور کر دوں گا۔"

گھوڑے نے کہا "بھائی آدمی! اس جنگل میں ایک ہرن رہتا ہے۔ اس کا میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔ اگر تم اسے مار دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔" آدمی نے کہا۔" یہ تو بڑی بات نہیں، لیکن ہرن بہت تیز دوڑتا ہے گھوڑے نے کہا" میں اس کا پیچھا کر لوں گا۔ جب ہرن قریب رہ جائے گا تو تم کمان میں تیر جوڑ کر مار دینا۔" آدمی نے کہا۔" مجھے تمہارے منھ میں لگام بھی لگانا پڑے گی تاکہ میں تمہیں ہرن کے پیچھے دوڑا سکوں۔"

گھوڑے کو تکلیف تو بہت ہوئی لیکن اس نے لگام لگوالی۔ اب وہ آدمی کو اپنی پیٹھ پر لے کر ہرن کی تلاش میں نکل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ہرن دکھائی دیا۔ اس آدمی نے گھوڑے کو تیزی سے ہرن کے پیچھے دوڑایا کہ ذرا سی دیر میں ایک تیر جو لگا تو ہرن زمین پر آن پڑا۔ گھوڑا اپنے دشمن کو مرا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔" بھائی آدمی، میں زندگی بھر تمہارا احسان مانوں گا۔ تم نے میرے دشمن کا خاتمہ کر دیا۔ اچھا اب اجازت دو۔ شکریہ۔" آدمی نے کہا "احسان اور شکریہ کیا؟ مجھے تو تمہارے فائدے کا اب جا کر علم ہوا ہے۔ میں تم کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ تم تو بڑے کام کے جانور ہو۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ــــ گھوڑے کے منھ سے لگام نہیں نکلی اور آدمی اس کی سواری کرتا پھرتا ہے۔"

اس کہانی میں ایک اچھی بات بیان کی گئی ہے یعنی یہ کہ جب کوئی دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو خود اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے کسی کے ساتھ برائی نہ کرنا چاہیے۔ اس کہانی کے ذریعہ اس بڑی سچائی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی شکل ایک قصے کی سی ہوتی ہے جس میں سچائی کو بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ادب کا لباس خیالی بھی ہوتا ہے اور اس میں کہانی پن بھی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی قصے کو سنتے یا پڑھتے ہیں تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک قصہ ہے۔ ایسا واقعہ کسی کے ساتھ پیش نہیں آیا لیکن اس کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں بڑی سچائی ہے۔ ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے۔

اس قصے کی خوبی یہ ہے کہ ہم جانتے ہوئے بھی کہ یہ قصّہ فرضی ہے، اس سے پورا پورا اثر لیتے ہیں۔ آپ نے فلمیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ جب سنیما ہال میں فلم دیکھنے جاتے ہیں تو آپ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہوتی ہے کہ :۔

- اس فلم کی کہانی فرضی ہے۔
- اس فلم کے اداکاروں کی زندگی میں ایسے واقعات کبھی پیش نہیں آئے۔
- یہ اداکار اسٹیج پر خود نہیں آئے بلکہ آپ ان کی تصویروں اور سایوں کو دیکھ رہے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کو جاننے کے باوجود آپ اس فلم کو دیکھ کر ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔ اب اگر کوئی ایسا آدمی جو ہماری آپ کی دنیا کا نہیں ہے وہ اچانک کہیں سے آکر یہ منظر دیکھے اور کہے کہ "آپ لوگ کتنے بے وقوف ہیں کہ محض سایہ دیکھ کر کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں صرف پردہ ہے" تو بتائیے کہ آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

آپ کہیں گے کہ "ہم بیوقوف نہیں ہیں، بیوقوف تو آپ ہیں جو ان تصویروں کو صرف تصویر یا سایہ سمجھ رہے ہیں اور اس سچائی کو نہیں دیکھتے جو اس کے پیچھے سے جھانکتی ہے۔"

وہ کہے گا کہ "پردے پر انسان کے اعضا کس قدر بڑے دکھائے گئے ہیں بھلا کہیں انسان کا سر اتنا بڑا ہوتا ہے، اس کی آنکھیں اتنی بڑی ہوتی ہیں۔"

دراصل ادب کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی بات کو دوسروں کو سمجھانے کے لیے کبھی کبھی بڑھا چڑھا دیتے ہیں۔ اسی لیے لوگ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یہ لوگ تو رائی کا پربت بنا دیتے ہیں"

دراصل بات یہ ہے کہ ادیب یا فنکار کا کام فوٹوگرافر کا کام نہیں ہے کہ وہ تصویر کو ہوبہو بنائے بلکہ اس کا کام تو آرٹسٹ کا کام ہے مثال کے طور پر کسی جگہ قحط پڑ گیا ہے، لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اس وقت ایک عورت کچھ دن کے فاقے سے مجبور ہوکر اپنے بچے کو بیچ رہی ہے۔ اب اگر کوئی فوٹوگرافر اس کی تصویر کھینچ لے تو ہم اس تصویر کو دیکھ کر نیچے لکھے ہوئے نتیجے پر پہنچیں گے۔

- عورت ایک ایسا کام کر رہی ہے جو کسی انسان کو نہیں کرنا چاہیے۔
- عورت ایک ایسا کام کر رہی ہے جو کسی ماں کو نہیں کرنا چاہیے۔
- عورت لالچی ہے کہ صرف روپے کے لیے اپنے بچے کو بیچ رہی ہے۔

یہ نتیجے تو ہم نے فوٹوگرافر کی تصویر کو دیکھ کر نکالے۔ لیکن اس تصویر کو کوئی مصوّر اپنی پنسل یا برش سے بناتا تو ہم کو وہ عورت صرف کمزور ہی نہ دکھائی دیتی بلکہ ایک قحط کی ماری ہوئی عورت نظر آتی۔ اس کے بدن کی ایک ایک ہڈی دکھائی دیتی۔ اس کی ممتا اس کی آنکھوں میں نظر آتی۔ ان آنکھوں سے اپنے بچے کو زندہ رکھنے

اور اس کو بچانے کی خواہش جھلکتی اور اسے اس روپے میں جو وہ بچے کے خریدار سے لیتی، ایک ہلکی سی امید نظر آتی کہ شاید اس کے سہارے وہ چند روز اور جی سکے اور پھر اپنے بچے کو واپس لے آئے۔ جو عورت خود فاقے سے مر رہی ہے، جس کا بچہ دودھ کے لیے تڑپ رہا ہے، وہ لالچی کیسے ہو سکتی ہے۔

اب ہم مصوّر کی تصویر کو دیکھ کر نیچے لکھے ہوئے نتیجے پر پہنچیں گے

- اس عورت کا عمل، زندہ رہنے کی خواہش پر منحصر ہے، جو کبھی غیر انسانی نہیں ہو سکتا۔
- اس عورت کا عمل ماں کے جذبے کی ترجمانی کرتا ہے۔
- یہ عورت بالکل لالچی نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہی منظر سے دو الگ الگ نتیجے نکلے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوٹو گرافر کی تصویر میں صرف سیدھی سادی سچائی تھی، جہاں حقیقت کو اصلی حالت میں پیش کر دیا گیا تھا اور فنکار کی تصویر میں حقیقت کو اس سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو سامنے نظر نہیں آتی۔ جس کے پیچھے ایک پوری کہانی ہے۔ فوٹو گرافر کا تعلق اس پوری کہانی سے نہیں ہے، اسے تو جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے اسی سے مطلب ہے۔

لیکن فنکار لکیر کا فقیر نہیں ہوتا وہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً وہ اس کیفیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اس سے تصویر کے نقش زیادہ صاف طریقے سے نظر آ جاتے ہیں۔ اس عمل کو ادب کی زبان میں "مبالغہ" کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے سینما کے پردے پر دیکھا کہ اداکار کی تصویر کو بڑا کیا گیا۔ لیکن اس سے تصویر میں فرق نہیں پیدا ہوا۔ تصویر پھر بھی اسی اداکار کی رہی۔ البتہ

اس کے چہرے کی لکیریں صاف نظر آرہی ہیں۔ ہم اسی لیے فوٹو گرافر سے اپنی تصویر کو بڑا کرواتے ہیں۔

آپ نے بڑے بڑے جلسوں میں دیکھا ہوگا کہ تقریر کرنے والا لاؤڈ اسپیکر سے مدد لے رہا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے اس کی آواز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ دور تک سنائی دیتی ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ یہ آواز کسی اور کی ہے۔ دراصل اس کی آواز کو بجلی کی مدد سے اتنا بڑھا دیا گیا کہ یہ آواز دور تک پہنچ سکتی ہے۔

دراصل ایک بات اور بھی ہے۔ مبالغہ سے بیان کرنے کا عمل بالکل فطری ہے۔ یہ ہماری عادت ہے کہ جب ہم کوئی بات سمجھا بجھا کر کہنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ سننے والے پر پورا پورا اثر پڑے تو ہم اس کو بڑھا چڑھا کر کہتے ہیں، جیسے فوٹو گرافر تصویر کو بڑا کرتا ہے یا لاؤڈ اسپیکر سے آواز اونچی ہو جاتی ہے ــــ یہ عمل روزمرہ کی زندگی میں بھی ہوتا ہے کہ ہم جب بہت جلدی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ایک منٹ میں آیا"۔

یا پھر جب کوئی ہم سے کسی کا پتہ پوچھتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا گھر یہاں سے چار قدم پر ہے۔ حالانکہ اگر اس وقت قدموں سے ہی ناپ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا فاصلہ ڈیڑھ دو ہزار قدم سے کم نہیں ــــ اب اگر کوئی شخص محض چار قدم پر چل کر رُک جائے اور یہ کہے آپ کا بتایا ہوا پتہ صحیح نہیں ہے۔ چار قدم چلنے کے بعد اس کا گھر نہیں آیا تو ہم کو اس کے اس طرح چار قدم چل کر رُک جانے پر ہنسی آئے گی کیونکہ ہمارے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ فاصلہ بہت زیادہ نہیں ہے یا جب ہم کہتے ہیں کہ ایک منٹ میں آیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گھڑی دیکھ کر ایک منٹ میں پہنچ جاؤں گا بلکہ ہمارا کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ میں بہت جلد آیا۔ سننے والا بھی ہماری بات سُن کر سمجھ لیتا ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

اس کی ایک مثال اور لیجیے۔ ایک بچہ صبح آٹھ بجے اسکول جاتا ہے اور پھر ۱۲ بجے واپس آتا ہے۔ وہ آتے ہی اپنا بستہ ایک طرف ڈال کر ماں سے کہتا ہے "ماں کھانا دو، بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔"

بچے کے اس جملے سے یہ مطلب نکالنا غلط ہوگا کہ بچہ مرنے کے قریب ہے بلکہ ماں بچے کے اس جملے کا مطلب سمجھ جاتی ہے کہ بچے کو بہت بھوک لگی ہے اور وہ فوراً دوسرے کام کو چھوڑ کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیتی ہے۔

بات کرنے کا یہ طریقہ بچوں ہی پر منحصر نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک فقیر راستہ چلتے آدمی کو روک کر کہتا ہے "بابا کچھ دو، کتنے دن ہو گئے ایک دانا اڑ کر منھ میں نہیں گیا۔"

آپ نے دیکھا کہ اپنی بھوک کے بیان کرنے میں فقیر نے کتنے مبالغے سے کام لیا۔ لیکن اس کا پورا پورا اثر ہوا۔ راستہ چلنے والے نے جیب سے نکال کر اسے کچھ پیسے دے دیے۔

بعض لوگ یہ کہیں گے کہ سائنس دان ایسا نہیں کرتے۔ یہ بات غلط ہے۔ سائنس دان بھی مبالغے سے مدد لیتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز چھوٹی سی ہے ننھی منی سی تو اس کو ایک مشین کی مدد سے بڑا کر لیتے ہیں۔ اس مشین کا نام ہے خورد بین۔ اس کی مدد سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بڑی دکھائی دینے لگتی ہے۔ مثلاً ایک کیڑا ہے جو اتنا چھوٹا ہے اتنا چھوٹا کہ آپ اس کو دیکھ نہیں سکتے لیکن اگر اسے خورد بین سے دیکھا جائے تو اس میں بڑا سا دکھائی دیتا ہے اور خورد بین سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سیل کا جانور ہے اور اب آپ اس کو اچھی طرح

دیکھ سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ یہ امیبا آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا' یہ کیسے دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے یہ امیبا نہیں ہے"

تو ہم کہیں گے کہ "ہم نے خوردبین کی مدد سے اس کی شکل کو بڑا کر لیا تاکہ اس کے جسم کی بناوٹ کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔"

ادب میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ہم اچھائیوں اور برائیوں کو اتنا بڑا کر دیتے ہیں کہ وہ صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ جب ہم کسی کو بُرا کہتے ہیں تو اسے شیطان کہہ کر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح نیک ہوتا ہے تو اسے فرشتہ کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے شیطان کہنے سے وہ نہ تو شیطان ہو گیا اور نہ فرشتہ کہنے سے وہ فرشتہ ہو گیا۔ دراصل ہم تو برائی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے تاکہ دیکھنے اور سننے والے بُرائی کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ یہی صورت فرشتہ کہنے کی تھی۔

اوپر کی مثال سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ادب کو پرکھنے کے لیے سائنس کی کسوٹی کی ضرورت ہے۔ دراصل سائنس کا طریقہ اس کا اپنا ہوتا ہے' ادب کا اپنا ہوتا ہے۔ ان دونوں کو کبھی نہ ٹکرانا چاہیے۔ جس طرح ہم ادبی اصولوں سے سائنسی عمل نہیں کر سکتے اسی طرح سائنسی اصولوں سے ادبی کام نہیں لیے جا سکتے۔

ایک مثال سنیے۔ کئی سال کی بات ہے کہ دلی میں عورتوں کے اسپتال سے ایک ننھا سا بچہ چوری گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ روپیے پیسے کی چوری اس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھ سکتی ہے۔ دلی کی ساری پولیس اس چوری کو پکڑنے میں لگ گئی۔ آخر پولیس اس چور کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ چوری ایک عورت نے کی تھی۔ جب عدالت میں اس سے جج نے پوچھا۔ "کیا تم نے چوری کی ؟

اس عورت نے جواب دیا: ۔" ہاں جج صاحب یہ بچہ میں نے چرایا۔ لیکن بات یہ تھی میرا اپنا کوئی بچہ نہ تھا اور میرے شوہر نے کہہ دیا تھا کہ چونکہ میرے کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے وہ مجھے گھر سے باہر نکال دے گا۔ جج صاحب! میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے ماں باپ بہن بھائی سب مر گئے ہیں۔ کوئی نہیں ہے، جسے میں اپنا کہوں سوائے میرے شوہر کے جو خود مجھے گھر سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کئی مہینے کی بات ہے جب میرا شوہر باہر گیا ہوا تھا میں نے موقع پا کر اسپتال جا کر اس بچے کو چرا لیا۔ جج صاحب! اگر میں بچے کو نہ چراتی تو میرا شوہر مجھے نکال دیتا۔"

جج نے کہا۔"ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ تم نے کیوں چرایا، ہمیں تو صرف یہ جاننا تھا کہ کیا تم نے چوری کی اور تم خود اپنا جرم مان رہی ہو۔ اس لیے میں تم کو وہ سزا دیتا ہوں جو ایک بڑی چوری کی دی جاتی ہے۔"

اب اگر اس معاملے کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے تو ہم یہی کہیں گے کہ عورت بے قصور ہے، لیکن عدالت کے سامنے تو عورت مجرم ہے۔ چنانچہ اگر جج عورت کی بات مان لے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے قانون کا لحاظ نہیں کیا۔ قانون تو چوری کرنے والی کی نیت اور اس کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے تو تعزیرات کے قوانین اہمیت رکھتے ہیں۔ جج ان قوانین کے اعتبار سے ہی سزا دیتا ہے۔ لیکن ہم ادیبوں اور شاعروں کے سامنے حقیقت کا وہی حصہ نہیں ہوتا جو سامنے ہوتا ہے بلکہ وہ بھی ہوتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے اس لیے اگر ہم اس موضوع پر کوئی کہانی لکھیں گے تو پھر اس میں یہ عورت بے قصور ثابت ہوگی اور سچ پوچھیے تو مجرم بھی وہی ہوگا جو نظر نہیں آرہا اور جسے قانون کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ یہ مجرم

ہے سماج ــــ جس نے عورت کو ایک بھیانک جرم کرنے پر مجبور کیا۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہر ایک علم کے اپنے اپنے قاعدے اور طریقے ہوتے ہیں۔ قانون کے طریقے الگ ہیں، ادب کے الگ ہیں۔ ادب ہر بات کو اس کے ہر پہلو سے دیکھتا ہے یہ اندھوں کا ہاتھی نہیں ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بارہ اندھے کہیں جا رہے تھے۔ ایک ہاتھی ملا۔ انھوں نے اسے چھو کر پتہ لگانے کی کوشش کی مگر کوئی ٹھیک سے پتہ نہیں چلا سکا جتنے منھ اتنی باتیں۔

- جس آدمی نے پیر چھوئے تھے اس نے کہا کہ یہ کھمبے کی طرح ہے۔
- جس نے پیٹ چھوا تھا اس نے کہا" یہ مٹکے کی طرح ہے"
- جس آدمی نے دُم چھوئی تھی اس نے کہا" یہ تو رسّی کی طرح ہے"
- جس نے کان چھوئے تھے اس نے کہا" یہ تو پنکھے کی طرح ہے"
- جس نے سونڈ چھوئی، اس نے کہا" یہ تو سانپ کی طرح ہے"
- جس نے دانت چھوئے اس نے کہا" یہ تو پتھر کی طرح ہے"

غرض اس طرح ہر اندھا اپنی اپنی بات کہہ رہا تھا اور اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ اندھے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے تھے، اس لیے کہ انھوں نے خود جیسا محسوس کیا، ویسا بتایا ــــ اس کے باوجود کوئی ہاتھی کو صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکا کیونکہ انھوں نے اسے حصوں میں سمجھا، مجموعی طور پر نہیں۔

(یہاں میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔) ہمارے یہاں اکثر لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ ادب میں جو بات کہی گئی ہے وہ زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا یہ کہ وہ بات کیسے کہی گئی ہے۔ بھائی ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہم ادب

پڑھتے ہوئے دونوں سے ایک ساتھ مزہ لیتے ہیں۔ جس طرح ہم جب کپڑا پہنتے ہیں تو کپڑے سے بھی لطف لیتے ہیں اور اس کی سلائی سے بھی۔ اگر کپڑا قیمتی اور خوبصورت ہے لیکن سلا اچھا نہیں تو اس کی ساری خوبصورتی ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح جیسے آپ کھانا کھاتے وقت اس چیز سے بھی مزا لیتے ہیں جو پکی ہے لیکن اس کا اس سے بھی تعلق ہے کہ کیسے پکی ہے۔ اگر غذا اچھی ہو لیکن پکانے میں جل جائے یا پکانے والے نے غلط طریقہ سے پکائی ہے تو اس کا سارا لطف ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح ادب میں بھی ہوتا ہے آپ کتنی ہی بڑی بات لکھیں لیکن اگر آپ نے اس کو اچھی طرح سے نہیں لکھا ہے یا آپ لکھنے کے طریقے سے واقف نہیں تو سارا لطف ختم ہو جائے گا۔ پڑھنے والا اس سے مزا نہ لے سکے گا۔

اس لیے ادب میں دونوں کی اہمیت برابر ہے۔ بات بھی اچھی ہو اور اچھے طریقے سے کہی گئی ہو۔

اسی لیے میں نے کہا کہ ہم ادب میں چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھتے بلکہ ہم انھیں مجموعی طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کہا تھا کہ ادب کا پہلا رشتہ زبان کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہم اس کو اپنی زبان کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ ہم جس زبان کو نہیں جانتے، اگر اس میں ادب لکھیں تو اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر آپ صبح صبح کسی باغ کی سیر کو جائیں وہاں آپ کو اوس کے ننھے منّے قطرے پتیوں اور پھولوں پر نظر آئیں تو آپ کو کتنے اچھے لگیں گے۔ آپ کو شاعر کے یہ اشعار یاد آتے ہیں ؎

کیا یہ تارے ہیں زمیں پر جو اُتر آئے ہیں
یا وہ موتی ہیں کہ جو چاند نے بکھرائے ہیں
کیا وہ ہیرے ہیں جو صحرا نے پڑے پائے ہیں

نہ بہت دور پہنچ جائے مری بات کہیں
اپنے آنسو تو نہیں بھول گئی رات کہیں

آپ شبنم کے اِن قطروں کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور آپ سوچتے ہیں کہ اپنے بہن بھائیوں کو بھی شبنم کی خوبصورتی سے مزا لینے کا موقع دیں۔ چنانچہ آپ شبنم کے اِن قطروں کو اکٹھا کر کے ہتھیلی پر بڑی احتیاط سے رکھ لیتے ہیں اور بہت آہستہ آہستہ گھر آتے ہیں اور وہاں سارے گھر کو اکٹھا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو میں کتنی خوبصورت چیز لایا ہوں۔ سب لوگ بڑے شوق اور چاؤ سے دیکھتے ہیں تو آپ اُن کے سامنے ہتھیلی کر دیتے ہیں۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

" ارے یہ تو پانی ہے۔ یہ تو ہمارے گھر میں بھی ہے۔ اس کے لیے باغ تک جانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اس میں خوبصورتی کی کون سی بات ہے"

آپ کہتے ہیں کہ " ارے بھائی یہ پانی نہیں ہے شبنم ہے"۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود آپ کو اب یہ اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ پھولوں پر تو اور ہی بات تھی۔"

اس کی وجہ کیا ہے۔ دراصل اس میں کوئی کیمیاوی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پہلے بھی وہ پانی کا قطرہ تھا اور اب بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہوا کہ جگہ بدل گئی۔ اس کی خوبصورتی کا تعلق پتوں اور پھولوں سے تھا۔

آپ کو اسی نظم کے چند شعر اور یاد آئے۔

جس طرح باغ کے پھولوں کو چمن پیارا ہے
بن میں جو کھلتی ہیں کلیاں انھیں بن پیارا ہے
یوں ہی شبنم کو بھی اپنا ہی وطن پیارا ہے

یہی زبان کا مسلہ ہے اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ شعر کا ترجمہ نہیں ہو سکتا ورنہ اس کی خوبصورتی اسی طرح ختم ہو جائے گی جیسے شبنم ہتھیلی پر پہنچ کر شبنم نہیں رہی وہ پانی کی پانی ہو گئی۔ حالانکہ جب یہی شبنم پھولوں پر تھی تو ہم اسے پانی نہیں کہہ سکتے تھے۔

ادبی سچائی بڑی سچائی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق زندگی سے بڑا گہرا ہوتا ہے عام آدمی جو کچھ سامنے نظر آتا ہے، اس کو سچ کہتے ہیں۔ چاہے اندرونی سچائی کچھ اور ہو۔

ایک عورت اپنے بھوکے بچوں کو تسلی دینے کے لیے ایک ہانڈی میں پانی بھر کر چولھے پر چڑھا دیتی ہے اور بچوں کو یہ کہہ کر سلاتی ہے کہ "سو جاؤ چاول پک رہے ہیں۔ جب پک جائیں گے تو میں تم کو اٹھا کر کھلا دوں گی" ـــ اس طرح بچے سو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتے ہیں ـــ لیکن اس عمل میں ماں کے اوپر کیا کچھ نہیں بیت گیا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ حقیقت اور سچائی کو صرف اس کی ظاہری شکل میں دیکھتے ہیں وہ شاید کہیں کہ یہ عورت کیسی ماں ہے جو اپنے بچوں سے جھوٹ بولتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے، ایک شاعر یا ادیب کی آنکھ سے، تو یہ جھوٹ جھوٹ نہیں ہے۔ اسی لیے ادب میں ایسے جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے۔

فارسی کے مشہور ادیب اور شاعر سعدی نے اپنی کتاب گلستان میں ایک قصہ لکھا

ہے ۔ جو کچھ اس طرح سے ہے :

○ ایک بادشاہ تھا ۔ اس نے ایک قیدی کو موت کی سزا دی بیچارہ قیدی زندگی سے مایوس ہو گیا ۔ اس نے سوچا کہ اب بادشاہ اس سے بڑی سزا کیا دے گا ۔ اس نے ناامید ہو کر بادشاہ کو گالیاں دینا شروع کر دیں ۔ بادشاہ نے اپنے ایک وزیر سے پوچھا ۔۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے"۔ بادشاہ کا یہ وزیر بڑا نیک دل اور بہت اچھا تھا ۔ اس نے کہا "جہاں پناہ ! یہ آپ کے جان و مال کو دعا دے رہا ہے "۔ بادشاہ کا ایک اور وزیر تھا یہ بڑا بڑا آدمی تھا اس نے جو یہ سُنا تو کہا " جہاں پناہ ! ہم لوگوں کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں جھوٹ بولیں ۔ دراصل یہ قیدی آپ کو گالیاں دے رہا ہے " بادشاہ کو یہ بات بہت بری لگی اور اس نے اس وزیر کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بولا " مجھے وہ جھوٹ زیادہ اچھا معلوم ہوا بہ نسبت تیرے سچ کے ۔ اس لیے کہ اُس جھوٹ کے پیچھے مصلحت تھی اور نیکی کا جذبہ کام کر رہا تھا ۔ اور تیرے سچ کے پیچھے بُرائی ہے جس سے ایک آدمی کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ عقلمندوں نے صحیح کہا ہے کہ وہ جھوٹ جس میں مصلحت شامل ہو ، اس سچ سے بہتر ہے جس سے فتنہ اٹھ سکتا ہے "۔

آپ نے دیکھا کہ اندرونی حقیقت کتنی اہمیت رکھتی ہے بہ نسبت اس میکانکی

حقیقت کے، جو اپنی جگہ ختم ہو جائے۔

صحیح قسم کا ادب زندگی کی بڑی سچائی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کی سچی آواز ہوتا ہے اور زندگی کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی ادھوری رہے گی۔

امید ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ادب کسے کہتے ہیں اور ادب کا کیا طریقہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم کوئی بات محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کا کہنا ضروری ہے یا اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے گا تو ہمیں بات کہنے کے لیے اُس پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اماں جب چاول پکاتی ہیں تو جب تک ایک ایک دانا گل نہیں جاتا، اسے چولھے سے نہیں اُتارتیں۔ اسی طرح جب آپ جو کچھ کہنا لکھنا چاہتے ہیں اس کو گر آپ نے اپنے دماغ میں اچھی طرح تیار کر لیا ہے تو پھر اسے ضرور سب کے سامنے پیش کیجیے۔ اگر بات آپ کے سچّے دل سے نکلی ہے تو ضرور سننے اور پڑھنے والوں پر اثر کرے گی۔ علامہ اقبال کتنے بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے ایک شعر کہا ہے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

آیئے ہم سب طے کریں کہ ایسی باتیں لکھیں گے جو دل سے نکلیں اور دل میں گھر کر لیں۔ وہی ادب زندہ رہے گا جس میں لوگوں کی دلوں کی دھڑکن ہو گی۔ اردو کے مشہور شاعر نے کہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا     میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ دل کی بات جتنی تقریر کے بارے میں سچ ہے، اتنی ہی تحریر کے بارے میں بھی۔ آپ دنیا کے اچھے شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں پڑھیے، آپ کو خود اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

- ختم -